

فتح محمد ملک

نظم 'ذوق و شوق' کو سمجھنے کے لیے

فنون لطیفہ میں ہنگامی اور آفاقی، وقتی اور دوامی کے پراسرار تخلیقی رشتوں کا سراغ پانے کے لیے اقبال کی نظم 'ذوق و شوق' کا مطالعہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ نظم کا پہلا مصرع ہی اس بات کا اعلان ہے کہ اس نظم کا موضوع 'قلب و نظر کی زندگی' ہے۔ ہر چند آفاقی جذبات اور دائمی صداقتیں کسی مقام اور وقت کے حوالے سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں، تاہم انہیں اپنے زمانی و مکانی تناظر میں سمجھنے کی ایک اپنی الگ اہمیت ہے۔ یہ نظم ایک دلکش اور خیال انگیز منظر سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک نعتیہ فریاد پر آ تمام ہوتی ہے۔ یہ منظر پردہ وجود کے چاک چاک ہو جانے کی بدولت حسن ازل کی بے حجابی اور قلب و نظر میں صبح کے سماں سے عبارت ہے۔ گویا باطنی زندگی میں طلوع آفتاب سے گرد و پیش کی زندگی کے تمام تر خارجی مناظر نور کی ندیوں میں ذوب کر کہیں دور، بہت دور غائب ہو گئے ہیں۔ اس نورانی منظر میں شاعر دیکھنے اور سوچنے لگتا ہے:

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں؟

تخیل اقبال کو ان گزرے ہوئے کاروانوں کا تعاقب کرتے کرتے زمانِ مصطفیٰ میں لے جاتا ہے اور وہ یوں محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جیسے چند لمحوں میں وہ مدینۃ النبیؐ میں ہوں گے۔ ایسے میں:

آئی صدائے جبریل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی
چنانچہ اقبال کے تخیل کا رہوار وہیں رُک جاتا ہے اور اقبال آنحضرت ﷺ کے
سامنے اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کا رگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومات
ذکر عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات
قافلہٴ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُتِ کدہٴ تصورات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکہٴ وجود میں بدر و جنین بھی ہے عشق

یہ گویا اپنے زمانے کی ملتِ اسلامی کا تنقیدی محاکمہ ہے۔ ان اشعار پر اگر ان کے
تاریخی تناظر میں غور کیا جائے تو ان کا مفہوم بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اقبال
پر یہ نظم ۱۹۳۱ء میں قیامِ فلسطین کے دوران وارد ہونا شروع ہوئی تھی۔ اقبال فلسطین میں براستہ
لندن پہنچے تھے۔ لندن میں وہ دوسری گول میز کانفرنس (۷ ستمبر تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں مسلمان
مندوب کی حیثیت میں شریک ہوئے تھے۔ یہ کانفرنس مستقبل کے آزاد ہندوستان کے لیے ایک
وفاقی آئینی ڈھانچہ تعمیر کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ کم و بیش ایک سال پہلے اقبال اپنے

خطبہ الہ آباد میں برصغیر ہند کے لیے زیر غور وفاقی آئین کے تصور کو رد کر کے برصغیر میں جداگانہ مسلم مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ اس گول میز کانفرنس میں شامل پیشتر مسلمان مندوبین کا برطانیہ نواز رویہ بھانپ کر وہ کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ گول میز کانفرنس کے بعد فلسطین میں انہیں مؤتمر عالم اسلامی کے منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ چنانچہ وہ فرانس میں برگساں اور لوئی مسینیوں اور اٹلی میں مسولینی اور افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان سے ملاقات کے بعد ۶ دسمبر کو بیت المقدس پہنچ گئے۔ گول میز کانفرنس کی طرح مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس سے بھی وہ کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی ۱۵ دسمبر کو واپس چلے آئے۔ اس ۹ روزہ قیام کے دوران انہوں نے فلسطین کی سیر کے ساتھ ساتھ مؤتمر کے اجلاسوں میں مسلمان ملکوں کے حکمران طبقے کے اعلیٰ ترین نمائندوں سے ملاقات کی اور روانگی سے ایک روز پیشتر کانفرنس سے انگریزی میں خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں جہاں انہوں نے ملت اسلامیہ کو درپیش خطرات کی نشاندہی کی وہاں انہوں نے دنیائے اسلام کے سیاسی اور تہذیبی رہنماؤں کو دل سے مسلمان بننے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے خبردار کیا کہ:

”اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک مادی الحاد کی طرف سے ہے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی زویر طہران دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بری چیز نہیں ہے، لیکن اگر اس میں اعتدال کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی پیدا کر دینے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں، مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ ہے،

لیکن خود مسلمانوں سے بھی مجھے اندیشہ ہے۔ میں تو جب بھی سوچتا ہوں شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول ﷺ ہم پر فخر کریں؟ ہاں! جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں۔“

اقبال کی اس گفتگو کی روشنی میں اگر ہم اوپر دیئے گئے اشعار کو ایک مرتبہ پھر پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نظم کا فوری محرک وہ گہری مایوسی ہے جس نے مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس کے دوران اقبال کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہاں اقبال کو دنیائے اسلام کے سیاسی زعماء، علمائے دین اور دانشوران کرام سے بالمشافہ ملاقاتوں اور مؤتمر کے اجلاسوں میں اُن کے طرز فکر و اظہار سے براہ راست شناسائی کا موقع ملا تھا۔ یہاں کی باتیں اور ملاقاتیں اُن کے لیے مایوس کن ثابت ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُن کی تمام تخلیقی شخصیت ایک مقدس بے چینی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ احساس کہ دجلہ و فرات کے کنارے حق و باطل کے درمیان صف آرائی جوں کی توں موجود ہے مگر قافلہ حجاز میں کوئی حسینؑ نظر نہیں آتا۔ یوں کہیے کہ مسلمان حکمرانوں میں ایک سے ایک بڑھ کر شاہ حسینؑ تو موجود ہے مگر امام حسینؑ بننے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ علمائے دین اور مفتیان شرع متین کا حال حکمرانوں سے بھی بدتر ہے۔ عشق کی آگ بجھ چکی ہے۔ ملت اسلامیہ کی خاکستر یہاں وہاں اُڑتی پھرتی ہے اور شرع و دین خیالات کا بت کدہ بن کر رہ گئے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولین ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دین بت کدہٗ تصورات

مؤتمر سے اپنے الوداعی خطاب کی مانند اس نظم میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ ملت اسلامی اس وقت جس تہ در تہ تاریکی میں پڑی اوگھتی ہے، اسے صرف عشق ہی کی روشنی سے منور

کیا جاسکتا ہے۔ اس جدوجہد کا آغاز اہل حرم کے سومات... خود مسلمانوں کے بت کدہ تصورات کی تخریب و تباہی کے بغیر ناممکن ہے۔ چنانچہ اقبال کے دل میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ:

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں

بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومات

یہ احساس کہ اقبال کے عہد کا ”مسلمان اس قابل نہیں کہ رسول کریم ﷺ اس پر فخر کر سکیں“، اقبال کو بعد عجز و ندامت بارگاہِ مصطفیٰ میں لے جاتا ہے اور یوں نظم کا باقی ماندہ حصہ آنحضرت ﷺ سے راز و نیاز بن کر رہ جاتا ہے۔ ماضی مستقبل بننے کو بے چین ہو جاتا ہے:

تازہ مرے وجود میں معرکہ کہن ہوا

عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام ابولہب

اس نظم کے فوری محرکات کی تلاش میں نگلیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیائے اسلام کا حکمران طبقہ ابولہب کی پرستاری پر نازاں ہے۔ ایک فارسی نظم میں اقبال نے عرب و عجم ہر دو خطہ ہائے زمین میں ابولہب کو ارزاں اور مصطفیٰ کو نایاب بتایا ہے۔ اپنی نظم ”انقلاب اے انقلاب!“ میں وہ دنیائے اسلام کو خبردار کرتے ہیں کہ:

در کیسا ابن مریم را بدار آویختند

مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کرد با اُم الکتاب

انقلاب!

انقلاب، اے انقلاب!

نظم ”ذوق و شوق“ محمد مصطفیٰ ﷺ کی تلاش کی دین ہے۔ اس تلاش کا نقطہ آغاز مسلمانوں کے سیاسی اور دینی بتکدوں پر غزنوی بن کر ٹوٹ پڑنے سے عبارت ہے۔ اقبال کی نظر میں موثر عالمِ اسلامی بھی ایک ایسا ہی بتکدہ ہے۔ جب دوسری مرتبہ اقبال کو موثر کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے یہ سوچ کر اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ تو فرنگی سامراج ہی کا ایک ادارہ ہے۔ موثر کے استعماری کردار کی یہ بات بیشتر

مسلمانوں کو ناقابل یقین نظر آئے گی۔ اس لیے میں یہاں ڈاکٹر تاثیر کی ایک تحریر سے ایک طویل اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

”جس ملاقات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس میں ایک اور بات بھی جو قابل ذکر ہوئی تھی، اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے اور علامہ اقبال کی اپنی ذات سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب کو آکسفورڈ سے روڈز لیکچر دینے کی دعوت آئی۔ میں ان دنوں کیمبرج میں تھا اور ڈاکٹر صاحب کو اصرار سے لکھا کہ وہ اس دعوت کو رد نہ فرمائیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کا سفر انگلستان سیاسی حیثیت رکھتا تھا۔ روڈز لیکچر کی علمی حیثیت تھی۔ انگلستان کے ادیب اور اہل علم لوگوں نے زمان و مکان کے مسئلے کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معلوم کرنا چاہا۔ ڈاکٹر صاحب نے زمان و مکان کے اسلامی تصور پر لیکچر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان لیکچروں کا پہلے سے چرچا کر رکھا تھا۔ ذاتی اور قومی فخر کے ساتھ اقبال کے ادبی مرتبہ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں یقین دلایا کہ میں ضرور آؤں گا لیکن یکا یک ان کا ایک اور خط آیا اور اس میں لکھا کہ انہوں نے ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ مجھے اس کا بہت رنج ہوا۔ اس ملاقات میں وہ راز بھی منکشف ہوا۔ روڈز لیکچر کی دعوت لارڈ لوٹھین کے ذریعے آئی تھی۔ لارڈ لوٹھین علامہ کا بہت مداح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے کیمبرج میں ایک ملاقات کے دوران، میں مجھ سے کہا تھا: ”عالم اسلامی ہی میں نہیں، تمام مشرق میں اقبال جیسا اثر انداز مفکر اور کوئی نہیں۔“ یہ بھی کہا کہ: ”اقبال کے افکار تاریخ عالم کا رُخ بدل دیں گے سیاسی لوگ نہیں جانتے کہ اقبال کی طرح کے شاعر کس قدر مؤثر ہو سکتے ہیں۔“

اسی توہین نے علامہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فلسطین آ کر مؤتمر اسلامی میں شریک ہوں اور اسلامی ممالک تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ بظاہر یہ اچھی بات تھی۔ علامہ اقبال نے وعدہ کر لیا لیکن انہیں بہت جلد اس کا احساس ہو گیا کہ یہ مؤتمر برطانوی سامراج کی کرشمہ سازی کا نتیجہ تھی۔ اقبال برطانوی سامراج کا سخت دشمن تھا۔ روڈز لیکچر اور اس مؤتمر کی تاریخیں پاس پاس تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مروت کے پتلے تھے۔ وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ ممکن ہوا تو مؤتمر میں شریک ہوں گے۔ مؤتمر سے بچنے کا یہی طریقہ نظر آیا کہ آکسفورڈ نہ جائیں۔^۱

جناب حمزہ فاروقی نے اپنی کتاب ”سفرنامہ اقبال“ میں اس بات کا انکشاف بھی فرمایا ہے کہ عرب نوجوان میں مؤتمر کے انعقاد کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کے نمائندے بھی اس کے ممکنہ نتائج سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ میں جب ایک رکن نے اپنی تقریر میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ مجوزہ کانفرنس میں مسلمان مندوبین کی تقریروں سے ”یہود و نصاریٰ کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہوں گے۔“ تو وزیر نوآبادیات سر رابرٹ ہیملٹن نے جواب دیا تھا کہ:

”مجھے اس قسم کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے جذبات مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہائی کمشنر سے تحقیقات کرنے پر مجھے علم ہوا ہے کہ مفتی اعظم کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور وہ کانگریس کی کارروائی ایسے طریق پر انجام دیں گے کہ برطانوی یا فلسطین کی حکومت کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

مؤتمر کی افسردہ و مردہ قراردادوں سے بھی اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ آج ہی

۱ ڈاکٹر تاثیر، اقبال کے حضور، رسالہ فنون، (۲۱ جون ۱۹۷۵ء)، ص ۱-۳۔

۲ حمزہ فاروقی، سفرنامہ اقبال، اقبال اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۸۔

نہیں بلکہ اپنے آغاز میں بھی یہ موثر ایسی ہی بے جان اور پرفریب تنظیم تھی۔ یگ مین کرسچن ایسوسی ایشن کے عکس پر یگ مین مسلم ایسوسی ایشنوں کے قیام سے لے کر جدید عربی لغت کی تیاری اور حجاز ریلوے تک اس کی قراردادوں میں کہیں بھی عشق کی آنچ محسوس نہیں ہوتی۔ اقبال نے بہت اچھا کیا کہ کانفرنس کی تکمیل سے پہلے ہی مندوبین کو اپنی آستینوں میں چھپائے ہوئے بتوں کو توڑنے کا مشورہ دے کر لاہور واپس آ گئے۔ یہ ہے وہ تاریخی، سیاسی اور تہذیبی تناظر جس کے بغیر ”ذوق و شوق“ کی تفہیم و تحسین ناممکن ہے۔

جولوگ مسلمان ممالک میں سیاہ و سفید کے مالک ہیں، اُن میں سے کچھ جان بوجھ کر اور کچھ بے جانے بوجھے مغربی سامراج کے سیاسی آلہ کار بنے بیٹھے ہیں۔ ایسے میں اقبال کی امیدوں کا مرکز وہ مسلمان نوجوان ہیں جن کا ذکر انہوں نے موثر سے اپنے الوداعی خطاب میں رجائیت کے ساتھ کیا ہے اور جنہیں نظم ”ذوق و شوق“ میں ”ذرہ ریگ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنے زمانے کی دنیائے اسلام کی بے آب و گیاہ، خنجر اور تہ درتہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی خارجی زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر اقبال ”قلب و نظر کی زندگی“ کا رخ کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے غلام ماضی کی صدیوں کو پھلانگتے ہوئے واپس اسلام کے قرنِ اول میں جا پہنچتے ہیں اور رسول اکرم ﷺ کے حضور عرض گزارتے ہیں:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
مغند آگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرہ ریگ کو دیا تُو نے طلوع آفتاب
تیرہ و تار ہے جاں گردش آفتاب سے
طبع زمانہ تازہ کر گردش آفتاب سے